مغربی تعلیم کا زہر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اہل نظر جانتے ہیں کہ انسانی وجود کی طرح نظام تعلیم بھی اپنی ایک روح اور ضمیر رکھتا ہے۔ یہ روح اور ضمیر دراصل اس کے واضعین ومرتبین کے عقائد ونفسیات، زندگی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر، مطالعۂ کائنات وعلم اسماء کی اساس ومقاصد اوران کے اخلاق کا عکس اور پرتو ہوتا ہے، جو اس نظام کو ایک مستقل شخصیت، ایک مستقل روح اور ضمیر عطا کرتا ہے۔ یہ روح اس کے پورے ڈھانچہ، ادب وفلسفہ، تاریخ، فنونِ لطیفہ، علوم عمرانیہ، حتیٰ کہ معاشیات وسیاسیات میں اس طرح سرایت کرجاتی ہے کہ اس کو اس سے مجرد کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ بہت بڑے صاحب اجتہاد اور اعلیٰ تنقیدی صلاحیت رکھنے والے کا کام ہے کہ اس کے مفید اجزا کو مضر اجزا سے الگ کرکے ''خذما صفا ودع ماکدر'' پر عمل کرے اور اصل وزوائد میں فرق کرکے اس کا جوہر اور اس کی روح لے لے۔ طبعی وتجربی (سائنٹفک) علوم میں یہ کام بہت زیادہ مشکل نہیں، لیکن ادب وفلسفہ اور علوم عمرانیہ میں یہ کام بڑا مشکل اور نازک ہے، خاص طور پر جب کوئی ایسی قوم جو متعین ومحکم عقائد، مستقل فلسفۂ حیات اور مسلک زندگی، اپنی ایک مستقل تاریخ جو محض ماضی کا ایک ملبہ (Debris) نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے نشان راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے لئے پیغمبر کی شخصیت اور اس کا زمانہ آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے، جب کسی ایسی قوم یا دور کا نظام تعلیم قبول کرتی ہے، جو اساس وبنیاد اور مثال ومعیار میں اس سے مختلف بلکہ اس کی ضد واقع ہوئی ہے، تو قدم قدم پر تصادم ہوتا ہے اور ایک کی تعمیر دوسرے کی تخریب اور ایک کی تصدیق دوسرے کی نفی و تردید، ایک کا احترام دوسرے کی تحقیر کے بغیر ممکن نہیں، ایسی حالت میں پہلے ذہنی کشمکش، پھر عقائد میں تزلزل، پھر اپنے دین سے انحراف اور قدیم افکار واقدار کے بجائے جدید افکار واقدار کا آنا ضروری ہے۔ کسی قسم کی خوش نیتی، ضمیر کی خلش، سرپرستوں کی خواہش، خارجی وجزائی انتظامات اس امر کے وقوع میں حارج نہیں ہوسکتے، اس کی رفتار کو سست اور اس کے

وقوع کو موخر کر سکتے ہیں، ملتوی نہیں کر سکتے۔ درخت اگر اپنے طبعی نظام سے نشوونما پائے تو وہ اپنے برگ و بار ضرور پیدا کرے گا اور وقت پر پھل لائے گا۔ انسانوں کو اس کا اختیار ہے کہ درخت نہ لگائیں یا اس کو پانی نہ دیں یا جب تیار ہو تو اس کی ہستی کو ختم کر دیں مگر اس کا اختیار نہیں کہ ایک توانا و تندرست، سرسبز و شاداب درخت کو اپنے نوعی وجود و شخصیت کے اظہار اور وقت پر پھول لانے سے روک سکیں۔

یہی معاملہ مغربی نظام تعلیم کا ہے وہ اپنی ایک روح اور اپنا ایک منفرد ضمیر رکھتا ہے جو اپنے مصنفین و مرتبین کے عقیدہ و ذہنیت کا عکاس، ہزاروں سال کے طبعی ارتقاء کا نتیجہ، اہل مغرب کے مسلمہ افکار و اقدار کا مجموعہ اور ان کی تعبیر ہے۔ یہ نظام جب کسی اسلامی ملک یا مسلمان سوسائٹی میں نافذ کیا جائے گا تو اس سے ابتداءً ذہنی کشمکش، پھر اعتقادی تزلزل، پھر دینی اور بعد میں (الا ماشاء اللہ) عینی ارتداد قدرتی ہے۔ ایک سلیم الطبع مغربی مبصر محمد اسد، سابق (Leopold Weiss) جس کو مغرب کے نظام تعلیم اور مشرق میں اس کے نتائج کا وسیع تجربہ ہے، صحیح لکھا ہے:

"..... ہم نے گزشتہ صفحات میں اس بات کی تائید میں چند اسباب و دلائل پیش کئے ہیں کہ اسلام اور مغربی تمدن جو زندگی کے دو متضاد نظریوں پر قائم ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ جب واقعہ یہ ہے تو ہم کیسے اس بات کی توقع کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کی مغربی بنیادوں پر ایسی تعلیم و تربیت (جو مجموعی طور پر یورپ کے علمی و ثقافتی تجربوں اور ان کے تقاضوں پر مبنی ہے) مخالف اسلام اثرات سے پاک ہو سکتی ہے۔

ہماری اس توقع کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں، اگر ہم بعض ایسے غیر معمولی حالات کا استثناء کر دیں جن میں کسی انتہا درجہ کے روشن اور فائق دماغ کے لئے ایسا ممکن ہوا کہ وہ اپنے دری مضامین سے متاثر نہیں ہو سکا تو بھی عام اصول یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کی مغربی تعلیم و تربیت ان کو اس قابل نہیں رکھے گی کہ وہ اپنے کو اس مخصوص ربانی تمدن کا نمائندہ سمجھیں جس کو اسلام لے کر آیا۔ اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ان روشن خیالوں کے اندر دینی عقائد برابر مضمحل ہوتے جا رہے ہیں جنہوں نے مغربی بنیادوں پر نشوونما حاصل کیا ہے۔" (Islam at the Crossroads P.83,84)

پھر وہ نصاب تعلیم کے مختلف اجزاء کے متعلق علیحدہ علیحدہ گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مغربی ادبیات کی تعلیم کا انجام اس شکل میں جو اس وقت اکثر اسلامی اداروں میں رائج ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام مسلمان نوجوانوں کی نگاہ میں ایک اجنبی چیز بن جائے، یہی بات بلکہ اس سے بہت زیادہ یورپ کے فلسفۂ تاریخ پر صادق آتی ہے، اس لئے کہ یورپ کا قدیم نظریۂ تاریخ یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی گروہ ہیں: رومی (Romans) اور وحشی (Barbarians) تاریخ کو اس طرح پیش

کرنے کا ایک پوشیدہ مقصد ہے، وہ یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مغربی اقوام اور ان کا تمدن ہر اس چیز سے زیادہ ترقی یافتہ ہے جس کا اس وقت تک وجود ہوا یا آئندہ کبھی دنیا میں وجود ہوسکتا ہے اس سے اہل مغرب کے حصول اقتدار کی کوشش اور مادی طاقت کا اخلاقی جواز پیدا ہوتا ہے اور وہ حق بجانب ثابت ہوتی ہے۔'' (Islam at the Crossroads P-95)

آگے چل کر وہ کہتے ہیں:

''تاریخ کی اس طرح کی تعلیم نوجوانوں کے دماغ میں اس کے علاوہ کوئی اور اثر نہیں چھوڑ سکتی کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوں اور اپنی پوری ثقافت (کلچر) اور اپنے مخصوص تاریخی عہد کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں اور مستقبل میں ان کے لئے ترقی و خدمت کے جو وسیع اور روشن امکانات ہیں، ان کا انکار کرنے لگیں۔ اس طرح وہ ایک ایسی منظم تربیت حاصل کرتے ہیں جس میں اپنے ماضی اور اپنے مستقبل کی حقارت پورے طور پر کارفرما ہوتی ہے، ان کے نزدیک ان کے مستقبل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مغربی معیار کے مطابق اور مغرب کے افکار و اقدار سے ہم آہنگ ہوں۔'' (Islam at the Crossroads P-97)

آگے چل کر وہ بڑی جرات کے ساتھ کہتے ہیں:

''اگر مسلمانوں نے زمانۂ ماضی میں علمی تحقیق و تفکر کے کام کو نظر انداز کر کے غلطی کی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس غلطی کی اصلاح کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ مغرب کا نظام تعلیم جوں کا توں قبول کر لیں، ہماری پوری تعلیمی پسماندگی اور علمی بے بضاعتی اس مہلک اثر کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو مغرب کے نظام تعلیم کی اندھی تقلید، اسلام کی مخفی دینی طاقتوں پر ڈالے گی، اگر ہم اسلام کے جوہر کو یہ سمجھ کر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک مستقل علمی و تہذیبی عنصر ہے تو ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ ہم مغربی تمدن کے ذہنی ماحول اور فضا سے دور دور رہیں، وہ فضا جو ہمارے معاشرہ اور ہمارے میلانات پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے تیار ہے۔ مغرب کے طور و طریق اور اس کے لباس و مظاہر زندگی کو قبول کر لینے سے مسلمان آہستہ آہستہ مغرب کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ خارجی مظاہر کی تقلید اس ذہنی رجحان تک پہنچا دیتی ہے۔'' (Islam at the Crossroads P-100)

اس نتیجہ کی پیشین گوئی ان بعض مفکرین نے بھی کی ہے، جو ایشیائی اور مشرقی ممالک میں اس نظام تعلیم کو رواج دینے والے تھے، مشہور انگریز اہل علم لارڈ میکالے نے جو ۱۸۳۵ء میں اس تعلیمی کمیٹی کے صدر تھے، جو یہ طے کرنے کے لئے بیٹھی تھی کہ ہندوستانیوں کو مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی زبان میں تعلیم دی

جایا کرے، اپنی رپورٹ میں لکھا تھا: ''ہمیں ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان ترجمان ہو۔ یہ ایسی جماعت بنانی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے اور الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو'' (تاریخ التعلیم از میجر باسو، صفحہ ۸۶)

یہ مغربی نظام تعلیم درحقیقت مشرق اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی (Genocide) کے مترادف تھا۔ عقلائے مغرب نے ایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس سانچہ میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لئے جابجا مراکز قائم کئے جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا۔ اکبرالہ آبادی مرحوم نے اس سنجیدہ تاریخی حقیقت کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے، ان کا مشہور شعر ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایک دوسرے شعر میں انہوں نے مشرقی و مغربی حکمرانوں کا فرق اس طرح بیان کیا ہے:

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں　　مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اس کے کئی برس بعد اقبال نے (جنہوں نے اس نظام تعلیم کا خود زخم کھایا تھا) اس حقیقت کو زیادہ سنجیدہ انداز میں اس طرح پیش کیا:

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی　　کہ ازوے روحِ قومے می تواں کشت

(ارمغان حجاز صفحہ ۱۴۴)

تعلیم جو قلب ماہیت کرتی ہے اور جس طرح ایک سانچہ کو توڑ کر دوسرا سانچہ بناتی ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو　　ہوجائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب　　سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

(ضرب کلیم)

وہ مغرب کے اس نظام تعلیم کو دین و اخلاق کے خلاف ایک سازش قرار دیتے ہیں:

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم　　ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

(ضرب کلیم)

☆.....☆.....☆